اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۹، شمارہ۱، مسلسل شمارہ:۳۷۱، سال ۲۰۲۴ء

اُردو نظم اور معاشی عالمگیریت: اکیسویں صدی کے تناظر میں

محمد بُرہان حسن
وزٹینگ فیکلٹی اُردو
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

URDU POEM AND ECONOMIC GLOBALIZATION
IN THE CONTEXT OF THE 21ST CENTURY

Muhammad Burhan Hassan
Visiting Faculty Urdu
Government College University, Lahore

Abstract

One of the main goals of globalization is to gain economic advantage. Politics and culture are promoted only through economic globalization. Economic globalization aims to break down economic barriers, promote free trade and multinational companies. Supporters of this process claim that it will be possible to end poverty in the world, while the group with its opposite point of view says that instead of the world developing unformly, only a few people or nations will be able to develop. Economic globalization, where the world is reaping benefits, has proved to be a scourge for third-tier countries, which is extremely dangerous for local culture and trade. The same situation has been described by an Urdu poem written in the 21st century, which has been tried to be covered in this article.

Keywords:
Globalization, Economy, Urdu Poem, 21st Century, Contemporary Trends.

عالم گیریت کی اصطلاح کا باقاعدہ استعمال بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ اس سے قبل آفاقیت، لبرلائزیشن اور بین الاقوامیت جیسی اصطلاحات بھی کسی حد تک عالم گیریت کے مفاہیم کی وضاحت کرتی رہیں گو کہ اب یہ عالم گیریت کے قدیم تصورات میں شمار ہوتی ہیں۔ عالم گیریت کا جدید تصور قدیم سے یک سر مختلف معنی و مفاہیم پیش کرنے میں کام یاب ہو چکا ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری نے گلوبلائزیشن (عالم گیریت) کی وضاحت کچھ یوں کی ہے:

> "The process by which business or other organizations develop international influences or start operating on an international scale ." (1)

یعنی عالم گیریت وہ عمل ہے جس کے ذریعے تنظیمیں کاروبار یا دیگر تنظیمیں بین الاقوامی اثرات مرتب کرتی ہیں یا بین الاقوامی سطح پر کام کرنا شروع کرتی ہیں۔ عالم گیریت کی تین مرکزی شاخیں معاشی، سیاسی اور ثقافتی عالم گیریت ہیں۔

یوں تو عالم گیریت نے زندگی کے ہر شعبے کو نہ صرف متاثر کیا ہے بل کہ اس کی کایا کلپ کر دی ہے لیکن حالیہ تصورات میں سے ایک اقتصادی / معاشی عالم گیریت ہے، عالمگیریت کے دیگر شعبے اسی سے جڑے ہیں۔

معاشی عالم گیریت سے مراد ایک ایسا نظام ہے جو متعدد ممالک کے قومی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر کام انجام دیتا ہے اور اس کے ذریعے ترسیل زر کا عمل معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اس عمل کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ گلوبلائزیشن عوام کے معیار زندگی کو بلند کرتی ہے نیز اس سے غربت کا خاتمہ ممکن ہے۔ جب کہ اس کے مخالف نقطۂ نظر کے حامل لوگ کہتے ہیں کہ گلابلائزڈ ورلڈ میں موجود عدم مساوات ان کے منفی ایجنڈوں کی عکاس ہے۔

معاشی عالم گیریت سے ہی سیاست اور ثقافت کو فروغ ملتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی صاحبِ ثروت قومیں کم زور قوموں کا معاشی، سیاسی اور ثقافتی استحصال کرتی رہی ہیں۔ یہ ایک تاریخی رجحان ہے اور اس کا اصل مقصد معاشی حد بندیوں کو توڑنا، آزاد تجارت اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا فروغ ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک طرف تو دنیا میں اشیا کی بہتات ہو گئی ہے اور دوسری طرف وہ طبقے ہیں جن کے پاس معاشی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں اور وہ بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یکساں ترقی کا پرچار کرنا عالم گیریت کا ایک بہانا تھا۔ ترقی کرنے میں عالم گیریت ناکام ہوئی ہے، اس کا معاشرے پر گہرا اثر

پڑا ہے کیوں کہ کم وسائل کے حامل لوگوں نے ان لوگوں کو دیکھا جن کے پاس وسائل کی بہتات تھی اور وہ جت گئے ایسی زندگی میں جس میں خواب کم اور سرمائے نے زیادہ جگہ لے رکھی ہے اسی سبب انسان اپنی زندگی کو خود جہنم بنتا دیکھ رہے ہیں۔

علی محمد فرشی (پ:۱۹۵۵ء) نے اس صورتِ حال کو اپنی طویل نظم "علینہ" میں واضح کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

علینہ!/ غار سے نکلیں / کوئی رستہ بنائیں / اس گھنی، گاڑھی، سیاہی سے نکلنے کا/
اندھیرے، اندھے، زہریلے دھویں میں / کاربن ہوتی ہوئی عمریں کہاں ہیرا بنائیں گی /
کسی نیکلس، انگوٹھی اور جھمکے میں / چمک اٹھنا، کہاں دل کا مقدر ہے / ہمارے کوئلہ ہوتے
دنوں کا غم / ہمالہ نے کہاں رونا ہے / کس تاریخ کا چہرہ بھگونا ہے!(۲)

عالم گیریت چوں کہ صنعتی دور کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے، اس لیے جیسے صنعتی انقلاب نے زرعی معاشرے کی قدروں، تصورات، افسانوی تخیلات اور اخلاقیات کے ساتھ متصادم ہو کر بھائی چارے، انصاف اور طاقت کو فروغ دیا۔ ایسے ہی عالم گیریت نے تیسری دنیا میں عوام کی بنیادی قدروں پر ضرب لگائی اور ایک طاقت ور اور غیر متوازن نقطۂ نظر ابھر کر سامنے آیا۔ بلاشبہ صنعتی و عالمی حد بندیاں توڑنے سے تمام ممالک کو فائدہ ہوتا ہے اور یہی بات مارکس نے بھی کی ہے لیکن مسائل وہاں جنم لیتے ہیں جہاں یکسانیت ختم ہو جاتی ہے اور پورا کھیل کچھ افراد کے ہاتھوں میں آ جاتا ہے ورنہ اس ترقی کی جانب قدم رکھنا تو اقوامِ عالم کے لیے ناگریز ہے۔ ایلون ٹوفلر (۱۹۲۸-۲۰۱۶ء) لکھتے ہیں:

"مارکس نے سرمایہ داریت اور سامراجیت پر شدید تنقید کرنے کے باوجود اس نقطہ نظر سے اتفاق کیا ہے کہ صنعتی نظام معاشرے کی سب سے ترقی یافتہ شکل ہے اور اس ترقیاتی مرحلے کی جانب تمام معاشروں کی پیش رفت لازمی اور ناگزیر ہے" (۳)

جن ممالک کو اس دوڑ میں شامل کیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ وہ مشینی دور اور مشینی آہنگ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے کیوں کہ انسانی رویے مشینی رویوں کے برعکس ہیں اس سے بھی مسائل جنم لیتے ہیں۔ جس سے معاشی و معاشرتی خلیج دن بہ دن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اور ترقی پذیر ممالک پستی کے پاتال میں گرتے چلے جارہے ہیں۔ اس تناظر میں حسین عابد (پ:۱۹۶۲ء) کی نظم "یہ جو دشت ہے کبھی باغ تھا۔" سے چند سطریں دیکھیے:

موت کے جنون نے / زندگی کی کمر توڑ دی ہے / وہ بے ریڑھ چال چلتی / کسی تیسری سمت
میں روپوش ہونا چاہتی ہے! / ڈول پر تال دیتا / دہی لینے گیا بچہ / چند بوٹیوں میں بٹا / ڈول
میں پڑا لوٹتا ہے / انسانی بچہ جنم دینے پر / عورت کو طعنہ ملتا ہے / کہ اس نے بم کیوں
نہیں جنا (۴)

حسین عابد کی اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا حقیقی مسئلہ ایٹم بم نہیں بل کہ روٹی ہے۔ ''چند بوٹیوں میں بٹا'' ہوا معاشرہ کس طرح صنعتی انقلاب برپا کر سکتا ہے اور کس طرح وہ عالمی قوتوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور ایٹم بم بنانے کا سوچ سکتا ہے۔ عالم گیریت نے وقت کو زیادہ متعین اور بہت سارے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ معاشی، ثقافتی اور سیاسی طور پر انسان انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔ ماضی کو دیکھے بغیر مستقبل کی طرف دوڑ رہا ہے اور یہ سب معاشی برتری کی خاطر ہے۔ وقت کا متعین ہونا اور انسان کا انتشار میں مبتلا ہونا عالم گیریت سے پہلے دوسری لہر کی دین ہے جسے عالم گیریت نے مزید تقویت دی ہے۔

معاصر عہد میں اردو نظم نے معاشی و سیاسی حوالے سے بڑھتے ہوئے المیوں کو بھرپور طریقے سے بیان کیا ہے کہ معاشی حوالے سے برتری حاصل کرنے کے لیے جادوگروں (ترقی یافتہ ممالک) نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے ہمارے مٹی کے برتنوں، گھروں اور دیگر اشیا کو کم تر قرار دے کر شیشے کی اشیا اور دیگر کرتبوں کو افضل قرار دیا ہے۔ اردو کا محاورہ ''انگلی پہ نچانا'' اس صورتِ حال پر صادق آتا ہے ترقی یافتہ ممالک چند سکوں کی خاطر ترقی پذیر ممالک کو اپنی انگلیوں پر نچاتے نظر آتے ہیں جس سے تماشائی خود حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

علی محمد فرشی کی نظم CYBERIA بھی ایسی ہی صورتِ حال کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ دیکھیے:

میرے پھولوں پہ / قیمت کی چٹ دیکھ کر / رک گیا آسماں / بک رہی تھی مشینوں پہ /
عورت کی خوشبو / جسے اپنی بغلوں میں چھڑکاؤ کر کے / انہیں نیند آتی تھی / کھانے کے
خوابوں کی قلت تھی شاید / سبھی اک جھلک دیکھنے کے لیے / کیمرے آن کر کے کھڑے
تھے / ہنسی اور کھلونے عجائب گھروں میں سجے تھے / مقدر کی سکرین پر رش نہیں تھا /
دعا کی ضرورت پرانی پڑی تھی / محبت تو ویسے بھی فیشن سے باہر تھی (۵)

مندرجہ بالا نظم سے معاشی عالم گیریت کی صورتِ حال واضح ہوتی ہے کہ اب ایسا زمانہ آ چکا ہے جس میں جنسی حظ کی جگہ بھی مشینوں نے لے لی ہے۔ ہم ایسے خطہ زمیں پر بس رہے ہیں جہاں جسم کے

متعلقات سے بھی چھٹکارا پایا جارہا ہے اور اب یہاں عورت کی خوشبو کو صرف اور صرف بغلوں میں چھڑک کر کام چلایا جاتا ہے۔ اس معاشرے سے کھانے کا تصور بھی کیمروں کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ہنسی، بچپن، معصومیت، بچے سبھی عجائب گھروں کی زینت بن چکے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ موجودہ سماج میں یہ سب فطری اور ثقافتی اجزا ناپید ہو چکے ہیں اور ہم سب میکانکی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ٹیکنالوجی نے ہمیں سمیٹ لیا ہے جو کہ سرمائے کی پیداوار ہے جس نے محبت جیسے فیشن کو کہنہ کر دیا ہے اور اب فیشن ہے ٹیکنالوجی کی بے حسی کا، سکرین کا، اور یہی انسان کی اصل شناخت بن چکے ہیں کہ دعا کی اب ضرورت نہیں رہی اور ایثار، محبت جیسے جذبے مشینی دور کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں جس سے انسان غیر انسانی سطح پر گر چکا ہے۔ اس نظم کا عنوان بھی Cyber سے Cyberia ہے یعنی ایسی مشینی اور ٹیکنالوجی کی دنیا جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ انسانی دنیا نہیں ہے بل کہ مشینی دنیا ہے۔ انسان کے اندر خداوندِ کریم نے بہت طاقت رکھی ہے۔ وہ حالات وواقعات کے مطابق خود کو ڈھال لینا جانتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے خود کو، اپنی روایات کو یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول جانے پر قادر ہے۔ انسان کس کس شے پر قادر ہے، اس کی عکاسی تنویر انجم (پ:۱۹۵۶ء) کی نظم ''ایک ٹریپر زپر'' کر رہی ہے۔

میں نے خود کو سکھایا / نزدیک کی چیزوں کو دور کر دینا / دور کی چیزوں کو پاس لے آنا /
اور سانس روک لینا / میں نے خود کو سکھایا / خود کو بھولنا / اور تماشائیوں کو بھی / اور اپنی
بھوک کو / اور اپنی پیاس کو / اور اپنے جسم کو (۶)

معاشی عالم گیریت نے طبقاتی تقسیم میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے علم برداروں کا یہ کہنا ہے کہ یہ تمام لوگوں کو معاشی لحاظ سے مضبوط بناتی ہے۔ مزید یہ کہ "It lifts all boats" جب کہ مخالفین کا کہنا ہے کہ اس میں تمام لوگوں کو یکساں سرمایہ نہیں ملتا بل کہ اس میں صرف امیر طبقے کا مفاد وابستہ ہے۔ اور وہ یہ نعرہ لگاتے ہیں "It lifts all yatch" سچ بھی یہ ہے کہ عالم گیریت کی وجہ سے معاشی طور پر توازن مزید بگڑا ہے اس میں امیر گھنٹوں میں پیسہ کئی گنا بڑھا رہا ہے جب کہ غریب غربت کی پاتال میں مزید دھنستا جارہا ہے۔ اس طبقاتی تقسیم پر مسعود قمر (پ:۱۹۵۵ء) لکھتے ہیں:

جہاز چیختے ہیں / اور / دنیا کانوں پر ایم پی تھری لگائے محوِ رقص ہے / کوڑا کرکٹ پر گدھ
بچوں کو نوچ رہے ہیں / مگر / کمپنیاں صاف ستھرے گوشت کو / پیکٹوں میں محفوظ کرنے
کے نئے نئے / طریقے سوچ رہی ہیں / چھاتیوں سے محروم مائیں / بچوں کے ہونٹوں پہ /

مٹی ملاخون لیپ کر رہی ہیں / مگر / آرٹ گیلریوں میں / رنگوں کے نئے نئے معانی پہ
سیمینار ہو رہے ہیں(۷)

مندرجہ بالا نظم سے طبقاتی تقسیم واضح ہو رہی ہے۔ اس میں جہاں عالم گیریت نے اپنا حصہ ڈالا ہے، وہاں قوموں کا اجتماعی شعور بھی اپنا رنگ جماتا ہے مثلاً تیسرے درجے کے ممالک میں اگر کوئی حکم ران اپنے عوام کو جدّت کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے، بے شک خود کو اور عوام کو گروی رکھ کر کرتا ہے تو عوام اس ٹیکنالوجی سے صحیح معنوں میں مستفید ہونے کی بہ جائے اس کا غلط استعمال کرتے ہوئے مزید پستی کی طرف جاتے ہیں۔ یہاں وطن عزیز کے ایک سابق آمر کی یاد آتی ہے جس نے ملک کو گروی رکھ کر عوام کو اپنے تئیں جدیدیت کی طرف لانے کی ٹھانی لیکن اُسے منہ کی کھانا پڑی کیوں کہ ہم نے ٹیکنالوجی سے جو کام لیا، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے کہ حالیہ ہونے والے سروے کے مطابق پاکستان ان ممالک میں سر فہرست ہے جو سب سے زیادہ عریاں(Pron) فلمیں دیکھتے ہیں۔ جب کہ لوگ ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ملک کی فی کس آمدنی بڑھانے میں جتے ہوئے ہیں۔ دنیا کے نقشے پر موجود ملک فن لینڈ (Findland) کے بجٹ کا حالیہ برسوں میں اسّی فیصد انحصار ان کی ایک کمپنی Nokia پر تھا۔ قوموں کی بھی ترجیحات ہوتی ہیں یہی ٹیکنالوجی یعنی موبائل فون جب ہمارے ہاتھ لگے ہیں تو ہم نے خود کو مزید سہل پسند بنالیا ہے جس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہر پیدا ہونے والے بچے پر بھی لاکھوں روپے قرض واجب الادا ہے۔ اس قرض کو چکانے کے لیے موجودہ نسل سوشل میڈیا پر بیٹھی سکرولنگ کر رہی ہے۔ حسین عابد کی نظم ''لاوارث چیخیں'' اس صورتِ حال کی عکاس ہے۔

ہمارے گردے بیچ کر جدید اسلحہ خریدا گیا / جدید ممالک میں بنگلے /
دور دراز کے سمندروں میں جزیرے / اور متروک اسلحے کی بھٹی میں پکائی /
زنگ آلود ڈبل روٹیاں ہمارے آگے پھینک دی گئیں / ہمیں ابکائی آتی ہے /
تو وہ آسمان کی جانب اٹھی ہماری مقعدوں پر / ٹھوکر مار کر دھاڑتے ہیں /
''غدارو، نمک حرامو، کفرانِ نعمت کرتے ہو'' (۸)

جن کو ہم اپنا مثالی سمجھتے ہیں اور جن جیسا ہونا چاہتے ہیں، جن کی دوڑ میں ہم دن رات شمولیت کرنے کے لیے بے چین ہیں، وہ ہمیں اتنا دھن ہی دیتے ہیں جس سے سانسیں چلتی رہیں۔ عالم گیریت نے بنیادی ضروریاتِ زندگی کے حوالے سے بھی ترقی پذیر ممالک کو نہیں نوازا۔ غربت کے خاتمے میں ناکامی اور

تقسیم دولت میں ناہم واری کے ساتھ ساتھ عالم گیریت ضروریات زندگی کی یکساں فراہمی میں بھی ناکام رہی ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم کے علاوہ دنیا کو دیگر ضروریات زندگی کی عدم دست یابی کے مسئلے کا بھی سامنا ہے۔ دنیا میں لگ بھگ ایک بلین لوگ وہ ہیں جنھیں ضروری ادویات میسر نہیں ہیں۔ اگر ناکافی خوراک کی بات کی جائے تو وہ بھی دنیا میں کئی بلین لوگ ہیں اور دوسری جانب وہ افراد ہیں جن کے پاس کئی ممالک جتنا سرمایہ ہے اور مہنگی سے مہنگی گاڑیوں اور دیگر سامانِ تعیشات کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ یقیناً ان کے کھانے کا اگر ایک وقت کا بل دیکھا جائے تو وہ غربت کی چکی میں پسے لوگوں کا کئی ماہ کا راشن ہو سکتا ہے۔ اس لیے عالم گیریت کی وجہ سے نہ تو یکساں ثقافت پروان چڑھی ہے اور نہ ہی یکساں معاشی تقسیم ہوئی ہے۔ اس غیر مساوی تقسیم پر معاصر اردو نظم میں بھرپور مزاحمت دیکھنے کو مل رہی ہے۔ اس ضمن میں تنویر انجم کی نظم ''وہ عجوبہ'' اہم ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

وہ سب جا رہے ہیں / سڑک پر ایک ہی جانب / بس پر لدے / بس کی چھت پر بھی /
ایک رکشے میں دو آگے چار پیچھے / ایک موٹر سائیکل پر میاں بیوی اور چار بچے / ایک
دوسرے کے ساتھ پھنسے ہوئے / اور دیکھ رہے ہیں / اس عجوبے کو / جو جا رہا ہے / ایک
لمبی چمکتی کار میں / بالکل اکیلا / پتا نہیں کیوں(۹)

مندرجہ بالا نظم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں دو طرح کی ثقافت پروان چڑھ رہی ہے۔ ایک وہ طبقہ ہے جو دولت کی ریل پیل کی وجہ سے نئے کلچر کو فروغ دے رہا ہے، یعنی رات گئے تک پارٹیوں میں مشغول رہنا، فیشن کے نام پر عریانیت اور بڑھتے ہوئے جرائم میں ملوث ہونا وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو دن رات محنت کر کے دھن کماتا ہے۔ اس طبقے کا ایک بڑا حصہ امیر طبقے کی نقالی میں اپنی محنت اور کمائی ضائع کرتا ہے۔ اس پورے منظر نامے میں جو تصویر ابھر کر سامنے آ رہی ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ بیش تر نوجوانوں کی صلاحیتیں، طاقت اور توانائی فضول اور لایعنی چیزوں میں صرف ہو رہی ہے ان لایعنی اشیا کو صارفی کلچر کا نام دیا گیا ہے۔ معاصر اُردو نظم میں صارفی کلچر کے پھیلاؤ پر بہت سی نظمیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔

یہ سرمایہ دار لوگ اپنے دائرے سے نکلے ہیں اور پوری دنیا انھیں دیوتا سمجھ کر پوجنے پر مجبور ہو گئی اور ساتھ آنسو بھی بہا رہی ہے۔ یہ دنیا کے کونے کونے تک صارفیت کو فروغ دینے میں کام یاب ہو چکے ہیں۔

کیا ریگستان، کیا جنگل اور کیا شہر۔ انھوں نے مقامی لوگوں کی لوک کہانیاں چھین کر ان کے ہاتھوں میں ایسی کہانیاں تھمائی ہیں جن کو پوری دنیا سمجھے بھی اور نہ بھی سمجھے۔ اور یہ خود ڈالر کی تپش میں لوگوں کو اپنا غلام بنانے میں جتے ہیں۔

معاشی عالم گیریت کا اصل مقصد معاشی حد بندیوں کو ختم کرنا اور آزاد تجارت کو فروغ دینا ہے۔ اس غرض سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان کمپنیوں کا پوری دنیا کی توانائی کے ذخائر یعنی تیل، گیس اور کوئلہ وغیرہ پر قبضہ ہے۔ اس لیے پوری دنیا کے مالیات کو قابو کرتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں موٹر بنانے، جدید ٹیکنالوجی حتیٰ کہ مواصلاتی سیاروں کا نظام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کمپنیاں اس قدر مضبوط ہو گئی ہیں کہ ان کے سامنے حکومتیں اپنے آپ کو بے بس پاتی ہیں۔

ملٹی نیشنل کمپنیاں اور ان کے سربراہان کیسے دن میں لاکھوں ڈالرز کماتے ہیں اور کمپنیاں کس طرح دنیا میں اپنا جال پھیلاتی ہیں اور کس طرح طبقاتی خلیج بڑھانے میں کردار ادا کرتی ہیں یہ سب دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بنیادی طور پر صدیوں کی غلامی و محکومی کی داستان کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ یہ صنعتی عہد کی نمائندہ کاروباری تنظیمیں ہیں جن کی جڑیں نو آبادیات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آج بھی یہ کمپنیاں ممالک پر تسلط بر قرار رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ ممالک و اقوام جو ملٹی نیشنل کمپنیوں کو دوسرے ممالک میں بھیجتی ہیں۔ اصل میں یہ پیسے کی پجاری ہیں اور پیسے کے مذہب میں لالچ، طمع، قتل و غارت، حق تلفی، لوٹ کھسوٹ سبھی کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ہی وسائل کو بہ روئے کار لاتے ہوئے ہماری ہی من پسند چیزیں، ہماری ضرورتوں کو سمجھتے ہوئے تیار کی جاتی ہیں بعد ازاں وہی ہمیں دگنے داموں بیچی جاتی ہیں۔ یہی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا منشور ہے جس میں وہ کام یاب ہو رہے ہیں۔ اس صورت حال پر حسین عابد کی نظم "یہ جو دشت ہے کبھی باغ تھا" صادق آتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

> موت کے سوداگر / کرنسی نوٹوں کے کنٹینر / محفوظ ملکوں کو روانہ کر رہے ہیں / وہ ایک ایسی کامیاب پراڈکٹ بیچتے ہیں / جس کی کوئی مانگ نہیں / اور جس کی مقبولیت میں / دن رات اضافہ ہو رہا ہے (۱۰)

ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنی مصنوعات کو فروخت کرنے اور عوام کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے برانڈز کا تصور متعارف کرایا جس میں مختلف موقعوں پر سیلز اور ڈیلز کی پیش کش کی جاتی ہیں جن سے

سادہ لوح عوام کو یہ بتایا جاتا ہے کہ انتہائی قیمتی اور اچھی اشیا آپ کو انتہائی مناسب داموں میں فروخت کی جارہی ہیں۔ کہیں نہ کہیں ان کمپنیوں کا مقصد عوام کو یہ باور کرانا بھی ہوتا ہے کہ یہ غریب ممالک و اقوام پر ترقی یافتہ ممالک کا احسان عظیم ہے اور وہ صدقہ و خیرات نکالنے کی خاطر یہ کام کر رہے ہیں ورنہ ان اشیا کی قیمت آپ کی استطاعت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ عوام ہیں کہ ایسے موقعوں پر ان برانڈز کی جانب لپکے چلے جاتے ہیں۔ برانڈز نے انسانی زندگیوں میں کس قدر دخل اندازی کی ہے اس کی مثال جاوید انور (۲۰۱۳ء) کی نظم "روبوٹوں کی اس دنیا میں" ملاحظہ فرمایئے:

> بچے روتے ہیں: / ممی، ممی! / ممی ممی۔۔ سارا دن ممی ممی / مجھ کو اور ضروری کام بھی ہیں اس دنیا میں / (بیوٹی پارلر، فٹنس کلب اور وغیرہ وغیرہ) / شوفر یہ لو ایک ہزار کا نوٹ ہے ان کو میک ڈونلڈ میں لے جاؤ / برگر ور گر لے دینا / میں آج بھی دیر سے آؤں گی / یہ ڈالر کی دھوپ ہے اس کی تپش جہنم جیسی / جن کے پاس بہت ہے وہ بھی، جن کے پاس نہیں ہے وہ بھی / اس آگ کا ایندھن ہیں (۱۱)

مندرجہ بالا نظم سے دیکھا جا سکتا ہے کہ برانڈز نے کس قدر تیسری دنیا کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ ان کا طریقۂ واردات بھی انوکھا ہے۔ یہ پُرکشش اشتہارات کے ذریعے پہلے ضرورت پیدا کرتے ہیں۔ پھر اسی ضرورت کے پیشِ نظر اشیا بناتے ہیں اور عوام الناس تک پہنچاتے ہیں۔ برانڈز کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ یہ انسان کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر تشہیر کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے نفسیاتی اثرات بھی بہت گہرے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی برائی کو بھی عام سا کر کے دکھاتے ہیں۔

ان برانڈز کی وجہ سے بھی بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب کوئی غیر ملکی کمپنی کسی تیسری دنیا میں ایک برانڈ کی دکان یا کاروبار شروع کرتی ہے تو وہ اس پر خاصی سرمایہ کاری کر کے اس کی تشہیر کرتے ہیں اور اپنے مختلف ہتھکنڈے ایڈز اور اشتہارات کی صورت میں اپناتے ہیں۔ جس سے تمام لوگ اس کی جانب رخ کرتے ہیں اور یقیناً برانڈز اچھی کوالٹی کی اشیا لوگوں تک پہنچاتے ہیں اس لیے ان کی شہرت بہت جلد ہو جاتی ہے۔ جس سے مقامی لوگوں کے کاروبار بند ہو جاتے ہیں اور وہ غربت کی چکی میں پسنے لگتے ہیں جس سے ملکی معیشت پر خاصا بوجھ پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر کار اس غربت و افلاس کے ہاتھوں معاشرے میں دیگر بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں مثلاً لوٹ کھسوٹ، ناانصافی، فریب اور قتل و غارت وغیرہ، نتیجتاً وہ معاشرت تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

ناصر عباس نیر (پ:۱۹۶۵ء) نے معاشی عالم گیریت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ سو موہنے سانپ کی طرح ہے:

> ”عالمگیریت سو موہنے سانپ کی مانند ہے اور اس کا جنم سرمایہ داریت کی کوکھ سے ہوا ہے جسے آسٹریائی مفکر جوزف شیمپٹر نے ”تخلیقی طور پر تباہ کن“ کا نام دیا ہے“ (۱۲)

جنسی رجحان ایک فرد کی تعریف کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جنسی رجحان کی یہ دولت اس کی ذہنی حالت کا اندزہ لگایا جاتا ہے اس لیے دنیا کے کسی بھی جنس کو کس شخص کے حالات زندگی جاننے کے لیے اساسی اہمیت دی جاتی ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا ہے جنسی وارداتوں کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں۔ جنسی عالم گیریت بھی معاشی عالم گیریت کی دین ہے جسے آج کل یعنی موجودہ عہد میں ڈارک ویب (Darkweb) کے ذریعے اس مقصد کو حاصل کیا جارہا ہے۔ ڈارک ویب بنیادی طور پر انٹرنیٹ کا ایک ایسا براؤزر ہے جس میں غیر قانونی سرگرمیاں کی جاتی ہیں مثلاً غیر قانونی تجارت۔ اس غیر قانونی تجارت کی ضمنی طور پر بہت سی شاخیں ہیں جن میں ایک جنسی ویڈیوز کو فروخت کر کے پیسہ کمانا ہے۔

چائلڈ پورن انڈسٹری (Child Porn Industry) بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ بچوں کی عریاں اور اخلاق باختہ فلموں اور ڈارک ویب کے ذریعے صارفی کلچر کو پھیلا معاشی فوائد حاصل کیے جارہے ہیں۔ اس جنسی عالم گیریت کے ذریعے ہی Lesbian اور Gay کلچر کو بھی تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ ڈارک ویب تک رسائی آسان نہیں ہے لیکن وہاں سے بڑی کاروباری شخصیات ویڈیوز اور دیگر مواد خرید کر دنیا کے سامنے لاتی ہیں اور بھاری معاوضہ وصول کرتی ہیں اس لیے ڈاکٹر احتشام علی (۱۹۸۲ء) نے اپنے مضمون میں ادب کو ایک کموڈیٹی یعنی شے / جنس قرار دیا ہے۔ اردو ادب میں اور خاص طور پر معاصر اردو نظم میں ڈارک ویب اور چائلڈ پورن انڈسٹری کے ذریعے معاشی سرگرمیاں کرنے والوں کی بھرپور مذمت کی جارہی ہے۔ اس حوالے سے تنویر انجم کی نظم ”پورنو فلموں کی تاریخ میں ایک نیا موڑ“ اہمیت کی حامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> پورٹ آف سپین میں / سڑکوں پر رہنے والے بچے / اپنے آپ کو / ایک قابل قبول قیمت پر فروخت کر دینے کے بعد / ان کی ملکیت بنے / جنہوں نے پورن فلموں میں / ایک نئے رجحان کو متعارف کروایا ہے / سڑکوں کو اپنا گھر کبھی نہ ماننے والے بچوں نے / پورٹ

آف سپین سے / ہالی وڈ کی جانب / اپنے مالکوں کے ہمراہ / غیر قانونی طور پر سفر کرتے
ہوئے / اپنے جسموں کے ساتھ / ایک دولت مند سرزمین کا خواب / فروخت نہیں کیا/
سڑکوں کی بے رحمی برداشت کیے ہوئے / بچوں کے بدن / ہالی وڈ میں پورنو فلموں کے نئے
مقبول رجحان کے لیے / استعمال کا بوجھ شاید برداشت کرلیں(۱۳)

تنویر انجم کی مندرجہ بالا نظم سے ہالی وڈ اور پورنو فلموں کی تاریخ سے ایک نئی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ کم عمر اور کم پیسوں کے عوض بچوں سے جنسی فعل کروانا، اس سے لاکھوں ڈالرز کا کاروبار کرنا اور کئی ملکوں میں اس کی کاپیاں بھیجنا، یہ سب گلوبلائزیشن کے منفی اثرات کے سبب ہی ممکن ہوا ہے۔ ہالی وڈ یا ان بڑے کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے علاوہ ہمیں اکثر خبروں میں بچوں پر جنسی تشدد پر مبنی مواد (فلمیں، تصویریں) دیکھنے، سننے کو ملتا ہے جو کہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان واقعات اور چائلڈ پورن انڈسٹری کا گہرا تعلق موجود ہے جہاں یہ تصویریں اور فلمیں بیچی جاتی ہیں۔ چائلڈ پورن انڈسٹری سرمایہ دارانہ استحصال کی بدترین شکل ہے۔ جنسی استحصال کے ذریعے منافع کمانے کے لیے متعارف کروائی گئی پورن انڈسٹری کے مواد کو پہلے دنیا بھر میں پھیلایا گیا اور جب لوگ اس کو دیکھ دیکھ کے اکتا گئے تو اس کی نئی اقسام متعارف کرائی گئیں جن میں سے ایک قسم چائلڈ پورن کی ہے۔ اور یہ سلسلہ پورٹ آف سپین تک محدود نہیں ہے۔ بل کہ یہ المیہ تیسری دنیا کا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر احتشام علی لکھتے ہیں:

"یہ ایک ایسی بے رحم عالم گیر دنیا کا بیانیہ ہے جس میں معاشی سفاکیت نے انسانی اقدار اور معاشرے کو "سیاہ ادوار" یا ڈارک ایجز میں دھکیل دیا ہے۔۔۔۔۱۳۵ سال تک یورپی استعمار کاروں کے استحصالی کلامیے مقامی آبادی کے جسموں اور روحوں کو بے رحمی سے کچلتے رہے اور اب پھر ایک بار استعماریت، عالم گیریت کے روپ میں معصوم پھولوں کو مسلنے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔" (۱۴)

جنسی عالم گیریت کا ایک اور پہلو بھی موجود ہے جس میں ایک عورت کو بچہ پیدا کرنے کے لیے کرائے پر لیا جاتا ہے اور دو سیر گندم کے عوض پانچ ماہ کا حمل کسی عورت کے پیٹ میں رکھا جاتا ہے اور اس کے عوض غریب عورت کو مزید کوئی چھوٹا موٹا لالچ بھی دے دیا جاتا ہے۔ یہ بھی استعماریت کا ہی ایک ہتھکنڈا ہے۔ علی محمد فرشی کی نظم "گے بی" سے جنسی/معاشی حقیقتوں کا صحیح معنوں میں ادراک ہوتا ہے۔ دیکھیے:

زندگی متھ نہیں / جو پرانے معانی کی / میا سے لپٹی رہے / جیسے بے بی کی تصویر کے /
کیپشن میں بتایا گیا ہے / اسے اپنی 'ما+ما' نے / اک اور لڑکی کے ایگ سے لیا تھا / تین ملین
میں سودا ہوا / باپ اس کا / بلڈی بہت لالچی تھا / مگر خوب رو، نوجواں مشرقی / کالی
آنکھوں کے اعجاز نے / دام دُگنا کیا / میزباں / (اس کی ماں، اک کرائے کی عورت)
نے / نومہ کے نولاکھ مانگے / ادا کر دیے / زندگی متھ نہیں ہے / پرانے معانی کی میا نہیں
ہے / یہ حوا نہیں ہے / یہ لزبائی کلچر کی بے بی ہے / گے بی ہے / جس میں / خدا آدمی،
باپ اور ماں کی / متھ کے معانی کی میا نہیں!(۱۵)

مندرجہ بالا نظم کا تعلق کسی اور دنیا سے نہیں بل کہ معاصر عہد کے المیوں سے ہے جس میں زندگی نئی راہوں کی مسافر اور نئی منزل کی متلاشی ہے اور بہت حد تک کامیابی بھی سمیٹ رہی ہے۔ زندگی کی جو سیدھی مضبوط دیواریں تھیں، جس میں تہذیبی اقدار و روایات موجود تھیں اور جس کی بنیاد پر معاشرے مہذب کہلاتے تھے، وہ اب ٹیڑھی اور کم زور دیواروں میں بدل کر دورِ ظلمات کی تہذیبی علامت بن گئی ہیں۔ جس میں انسان غیر مہذب کہلاتا تھا۔ آج ترقی اور ٹیکنالوجی کے بعد انسان کو سرمایہ دارانہ نظام نے انسانیت کی بلند سطح سے گرا کر اسی اندھیروں کی نگری میں لا کھڑا کیا ہے جہاں سے نکلنے کے راستے بہت محدود ہیں اور ہر طرف خوف و وحشت کا سماں ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) Pearsall, Judy, ed., Oxford Dictionary of English 2nd, (Oxford: Oxford University Press, 2006), 736.

(۲) علی محمد فرشی، علینہ،(راولپنڈی: مطبوعاتِ سمبل، اشاعت: بارِ دوم، ۲۰۲۲ء)، ۱۳۔

(۳) ایلون ٹوفلر، تیسری لہر، مترجم: تنویر اقبال،(لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۱ء)، ۱۳۲۔

(۴) حسین عابد، کھڈیوں پر بنے لوگ،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۳۳۔

(۵) علی محمد فرشی، محبت سے خالی دنوں میں محبت،(فیصل آباد: مثال پبلیشرز، ۲۰۱۶)، ۶۸۔

(۶) تنویر انجم، زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی،(کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۱۰ء)، ۱۳۔

(۷) مسعود قمر، بارش بھرا تھیلا،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ۵۷۔

(۸) حسین عابد، کھڈیوں پر بنے لوگ، ۱۱۵۔

(۹) تنویر انجم، نئے نام کی محبت،(کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۱۳ء)، ۱۲۵۔

(۱۰) حسین عابد، کھڈیوں پر بنے لوگ، ۳۴۔

(۱۱) جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں،(لاہور: قوسین پبلشرز، ۲۰۰۹ء)، ۷۶۔

(۱۲) ناصر عباس نیر، یہ قصہ کیا ہے معنی کا،(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۳۸۔

(۱۳) تنویر انجم، زندگی میرے پیروں لپٹ جائے گی، ۵۶۔

(۱۴) احتشام علی، جدید اردو نظم کی شعریات،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۹)، ۱۹۰۔

(۱۵) علی محمد فرشی، غاشیہ،(اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۴)، ۴۷۔

BIBLIOGRAPHY

- Ahtisham Ali, *Jadīd Urdū Naẓm Kī Sh'ariyāt*, (Lahore: Sanjh Publications, 2019).
- Ali Muhammad Farshi, *Mūhabbat se Khālī Dinon̲ me Mūhabbat*, (Faisalabad: Misal Publications, 2006).
- Ali Muhammad Farshi, *Ghashiyah*, (Islamabad: Porab Academy, 2014).
- Ali Muhammad Farshi, *Alīna*, (Rawalpindi: Sumbal Publication, Second Edition, 2022).
- Alvin Toffler, *Tīsrī Lehar*, (Trans.) Tanveer Iqbal, (Lahore: Moshal Books, 2001).
- Hussain Abid, *Khadion̲ Per Buny Log*, (Lahore: Sanjh Publications, 2022).
- Javed Anwar, *Bhar̲iye Soye Nahī*, (Lahore: Qusain Publishers, 2009).
- Masood Qamr, *Bārish Bhara Thela*, (Lahore: Sanjh Publications, 2021).
- Nasir Abbas Nayar, *Ye Qissa Kia He Ma'ani Ka*, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2022).
- Pearsall, Judy, ed., *Oxford Dictionary of English 2nd*, (Oxford: Oxford University Press, 2006).
- Tanveer Anjum, *Zindgī Mery Peron Se Lipat Jay Gi*, (Karachi: Aaj Ki Kitaben, 2010).
- Tanveer Anjum, *Naye Nām Kī Muhabbat*, (Karachi: Aaj Ki Kitaben, 2013).

❖❖❖